قرآن کی معاشی تعلیمات

سیّد ابوالاعلیٰ مودودی

(۳)

۱۵- لازمی زکوٰۃ اور اُس کی شرح قرآن نے اس تعلیم و ہدایت سے معاشرے کے افراد میں رضاکارانہ انفاق فی سبیل اللہ کی ایک عام رُوح پھونک دینے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ ہدایت کی کہ آپ کم سے کم انفاق کی ایک حد مقرر کر کے ایک فریضہ کے طور پر اسلامی ریاست کی طرف سے اس کی تحصیل اور تقسیم کا انتظام کریں:

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً (۹: ۱۰۳) (اے نبی) ان کے اموال میں سے ایک صدقہ وصول کرو۔

یہ "ایک صدقہ" کا لفظ اِس امر کی طرف اشارہ تھا کہ عام صدقات، جو فرداً فرداً بطور خود لوگ دیتے ہیں، اُن کے علاوہ ایک خاص مقدارِ صدقہ اُن پر فرض کر دی جاتے، اور اُس کا تعیّن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم خود کریں۔ چنانچہ اس حکم کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم نے مختلف اقسام کی ملکیتوں کے بارے میں ایک کم سے کم حد مقرر فرما دی جس سے کم پر فرض زکوٰۃ عائد نہ ہوگی، پھر بقدر نصاب یا اس سے زائد ملکیتوں پر مختلف اموال کے معاملہ میں زکوٰۃ کی حسبِ ذیل شرح مقرر فرمائی۔[۱۸]

(۱) سونے چاندی اور زرِ نقد کی صورت میں جو دولت جمع ہو[۱۹] اس پر ۲½ فیصد سالانہ۔

---

[۱۸] الشوکانی، نیل الاوطار، ج ۴، ص ۹۸-۱۲۴، مصطفی البابی، مصر، ۱۳۴۷ھ

[۱۹] بعد میں اجماع سے یہ طے کیا گیا کہ تجارتی اموال پر بھی ۲½ فیصد سالانہ کے حساب سے زکوٰۃ عائد کی جائے (الشوکانی، ص ۹۸)

(۲) زرعی پیداوار پر جبکہ وہ بارانی زمینوں سے ہو ۱۰ فیصد

(۳) " " " جبکہ وہ مصنوعی آب پاشی سے ہو ۵ فیصد

(۴) معدنیات پر جبکہ وہ نجی ملکیت میں ہوں اور دفینوں پر ۲۰ فیصد

(۵) مواشی پر، جو افزائش نسل اور فروخت کی غرض سے پالے جائیں زکوٰۃ کی شرح بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ جانوروں کے معاملے میں مختلف ہے جس کی تفصیل کتب فقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

یہ مقدار زکوٰۃ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اُسی طرح مسلمانوں پر فرض کی ہے جس طرح روزانہ پانچ وقت کی چند رکعت نمازیں آپ نے اُس کے حکم سے فرض کی ہیں۔ دینی فریضے اور لزوم کے اعتبار سے ان دونوں کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن مجید اس بات کو اسلامی حکومت کے بنیادی مقاصد میں شمار کرتا ہے کہ وہ نماز اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرے۔

اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ۔ (۲۲ : ۴۱)

(یہ اہل ایمان، جن کو دفاعی جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے، وہ لوگ ہیں) جنہیں اگر ہم نے زمین میں اقتدار بخشا تو یہ نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے، اور بدی سے روکیں گے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ ... وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔

(۲۴ : ۵۵ - ۵۶)

اللہ نے اُن لوگوں سے جو تم میں سے ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے یہ وعدہ کیا ہے کہ انہیں ضرور زمین میں خلیفہ بنائے گا ... اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

لیکن، جیسا کہ اوپر کی آیات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے، فرض زکوٰۃ کی تحصیل اور تقسیم کا

۴ - ج ۴، ص ۱۱۷ - تجارتی زکوٰۃ کا یہ اصول اُن کارخانوں پر بھی عائد ہو گا جو فروخت کے لیے مختلف قسم کے سامان تیار کرتے ہیں۔

انتظام اگرچہ اسلامی حکومت کے فرائض میں شامل ہے، مگر اسلامی حکومت نہ ہونے کی صورت میں یا مسلم حکومت کے اس طرف سے غفلت برتنے کی صورت میں، مسلمانوں پر سے یہ فرض ساقط نہیں ہو جاتا۔ بالکل اُسی طرح جس طرح نماز کا فرض ساقط نہیں ہوتا۔ کوئی اگر وصول کرنے اور تقسیم کرنے والا نہ ہو تو ہر صاحبِ نصاب مسلمان کو خود اپنے مال سے زکوٰۃ نکالنی اور تقسیم کرنی چاہیے۔

۱۶۔ اموالِ غنیمت کا خمس | فرض زکوٰۃ عائد کرنے سے جو فنڈ فراہم ہوتا ہے اس پر قرآن نے ایک اور مد کا اضافہ بھی کیا ہے اور وہ ہے اموالِ غنیمت (SPOILS OF WAR) کا ایک حصّہ۔ قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ہر لڑائی میں جو غنیمت کا مال فوج کے ہاتھ آئے اسے سپاہی بطورِ خود نہ لوٹ لیں بلکہ سب کچھ لاکر اپنے کمانڈر کے حوالہ کر دیں، اور کمانڈر اس کے پانچ حصے کر کے چار حصے ان سپاہیوں میں تقسیم کرے جنہوں نے معرکے میں حصّہ لیا ہو، اور پانچواں حصّہ الگ کر کے حکومت کے حوالہ کر دے:

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ (۸: ۴۱)	تم کو معلوم ہو کہ جو کچھ بھی غنیمت تم حاصل کرو اس کا پانچواں حصّہ اللہ اور رسول اور قرابت داروں[۱۰] اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافر کے لیے ہے۔

[۱۰] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں غنیمت کے خمس میں سے ایک حصّہ خود حضورؐ اپنی اور اپنے متعلقین کی ضروریات کے لیے لیتے تھے، کیونکہ زکوٰۃ میں آپ کا اور آپ کے رشتہ داروں کا کوئی حصّہ نہ تھا۔ لیکن آپ کی وفات کے بعد اس امر میں اختلاف ہوا کہ رسول اور قرابت داروں کا حصّہ کس کو دیا جائے۔ بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ یہ حصّہ آنحضرتؐ کے لیے سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت سے تھا اور اب یہ آپ کے خلیفہ اور اس کے متعلقین کا حق ہے۔ بعض دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی آپ ہی کے متعلقین کا حق ہے۔ آخر کار اس بات پر اتفاق ہوا کہ وہ حصّہ جو آنحضرتؐ اور ان کے متعلقین کے لیے تھا، اب اسلامی حکومت کی جنگی ضروریات کے لیے مخصوص کر دیا جائے۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۷۵-۷۷۔)

۱۷۔ مصارفِ زکوٰۃ | ان دونوں مدات سے جو مال حاصل ہو وہ قرآن کی رُو سے خزانۂ عامّہ (PUBLIC EXCHEQUER) کا کوئی حصّہ نہیں ہے جس کا مقصد زکوٰۃ دینے والوں سمیت تمام لوگوں کے لیے آسائشیں اور ضروری خدمات بہم پہنچانا ہوتا ہے، بلکہ قرآن نے اسے حسبِ ذیل مصارف کے لیے مخصوص کیا ہے:

اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ (۹: ۶۰)

صدقات تو مخصوص ہیں فقراء[۲۱] کے لیے اور مساکین[۲۲] کے لیے اور اُن لوگوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام کریں۔ اور ان کے لیے جن کی تالیفِ قلب مطلوب ہو[۲۳]، نیز وہ صرف ہونے چاہییں غلاموں کی گردنیں چھڑانے میں[۲۴]، قرض داروں کی مدد میں، اللہ

---

[۲۱] فقر کے اصل معنی حاجت کے ہیں اور فقیر ہر وہ شخص ہے جو اپنی ضرورت سے کم معاش پانے کے باعث مدد کا محتاج ہو (لسان العرب ج ۵ ص ۶۰-۶۱، بیروت ۱۹۵۶ء)

[۲۲] حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ مسکین وہ شخص ہے جو کما نہ سکتا ہو یا کمانے کا موقع نہ پاتا ہو۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۱۵۱) اس تعریف کی رُو سے تمام وہ غریب بچے جو ابھی کمانے کے قابل نہ ہوئے ہوں، اور اپاہج اور بوڑھے جو کمانے کے قابل نہ رہے ہوں، اور بے روزگار یا بیمار جو عارضی طور پر کمانے کے موقع سے محروم ہو گئے ہوں، مسکین ہیں۔

[۲۳] نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تین قسم کے لوگوں کو تالیفِ قلب کے لیے روپیہ دیا جاتا تھا (۱) جو مخالفینِ اسلام کمزور مسلمانوں کو تکلیفیں دیتے یا اسلام کی عداوت میں سخت تھے انہیں روپیہ دے کر نرم رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ (۲) جو لوگ اپنی قوم یا قبیلے کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے زبردستی روکتے تھے انہیں روپیہ دے کر اس روش سے باز آجانے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔ (۳) جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوتے تھے ان کی مالی مدد کی جاتی تھی تاکہ اُن کا اضطراب رفع ہو اور وہ مطمئن ہو کر مسلمانوں کے گروہ میں رہیں۔ (الجصاص ج ۳ ص ۱۵۲)

[۲۴] اس سے مراد وہ مسلمان بھی ہیں جو لڑائیوں میں دشمنوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر غلام بنا لیے جاتے تھے،

کی راہ میں[25] اور مسافروں کی خبر گیری میں[26]، اللہ کی
طرف سے ایک فریضہ کے طور پر۔

۱۸۔ تقسیمِ میراث کا قانون | کسی مرد یا عورت کی وفات پر اس کے متروکہ مال کے متعلق قرآن کا قانون یہ ہے کہ یہ مال اس کے والدین، اس کی اولاد، اور اس کی بیوی یا شوہر کے درمیان ایک مقرر نسبت کے ساتھ تقسیم کیا جائے۔ اور اگر والدین اور اولاد نہ ہوں تو اس کے حقیقی اور علاتی اور اخیافی (یعنی ماں شریک اور باپ شریک) بھائی بہنوں کو حصہ دیا جائے۔ اس کے متعلق مفصل احکام سورۂ نساء میں بیان ہوئے ہیں[27] (ملاحظہ ہو آیت ۷ تا ۱۲، اور آیت ۱۷۶) یہاں ہم بخوفِ طوالت انہیں نقل نہیں کرتے۔

اس معاملہ میں قرآن نے جو اصول اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ جو مال ایک شخص کی زندگی میں یکجا مرتکز ہو گیا ہو وہ اس کے مرنے کے بعد مرتکز نہ رہنے دیا جائے بلکہ اس کے قرابت داروں میں پھیلا دیا جائے۔ یہ اصول توریثِ خلفِ اکبر (PRIMOGENITURE) اور مشترک خاندانی جائداد (JOINT FAMILY SYSTEM) اور ایسے ہی دوسرے طریقوں کے برعکس ہے، جن کا

اور وہ غیر مسلم بھی جو مسلمانوں کے ہاں جنگ میں گرفتار ہو کر آتے اور فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نیز وہ غلام بھی مراد ہیں جو پہلے سے غلام چلے آ رہے تھے۔

[25] اللہ کی راہ سے مراد جہاد اور حج ہے۔ جہاد میں جانے والا رضاکار اگر اپنی ضروریات کی حد تک مالدار بھی ہو، تب بھی وہ زکوٰۃ لے سکتا ہے۔ کیونکہ جہاد کے لیے تیاری کرنے اور سفر وغیرہ کے مصارف بہم پہنچانے کے لیے آدمی کا ذاتی مال کافی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حج کے سفر میں اگر آدمی کا زادِ راہ ختم ہو جائے تو وہ بھی زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۵۷-۱۵۶۔ نیل الاوطار ج ۴، ص ۴۶-۱۴۴)

[26] مسافر اپنے گھر پر چاہے مالدار بھی ہو، لیکن حالتِ سفر میں اگر وہ مدد کا محتاج ہو جائے تو اسے زکوٰۃ لینے کا حق پہنچتا ہے۔ (الجصاص، ج ۳، ص ۱۵۷)

[27] نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قانون کی جو تشریح فرمائی ہے اس کی رو سے قریب ترین رشتہ داروں کی غیر موجودگی میں میراث قریب تر رشتہ داروں کو پہنچے گی اور ان کی غیر موجودگی میں بدرجہ آخر اسے ان لوگوں

بنیادی مقصد یہ ہے کہ مرتکز شدہ دولت مرنے والے کے بعد بھی مرتکز ہی رہے۔

اسی طرح قرآن متبنّٰی بنانے کے طریقے کو بھی رد کر دیتا ہے اور یہ قاعدہ مقرر کرتا ہے کہ جو لوگ واقعی رشتہ دار ہیں، میراث میں حق انہی کا ہے، کسی غیر آدمی کو بیٹا بنا کر مصنوعی طور پر وارث نہیں بنایا جا سکتا:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَاءَكُمْ اَبْنَاءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ (۳۳: ۴)

اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا ہے، یہ تو ایک بات ہے جو تم بس اپنے منہ سے نکالتے ہو۔

وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (۳۳: ۶)

اور رشتہ دار ہی اللہ کی کتاب میں ایک دوسرے کے زیادہ حق دار ہیں۔

لیکن حقیقی وارث رشتہ داروں کے حقوق کی پوری طرح حفاظت کر دینے کے بعد قرآن ان کو یہ ہدایت کرتا ہے کہ تقسیم میراث کے موقع پر جو غیر وارث رشتہ دار آئیں ان کو بھی وہ اپنی خوشی سے کچھ نہ کچھ دیں:

وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِّنْهُ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ (۴: ۸-۹)

اور جب تقسیم کے موقع پر رشتہ دار اور یتیم اور مسکین لوگ آئیں تو ان کو بھی اس میں سے کچھ دو اور ان سے اچھی طرح بات کرو۔ لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے پیچھے کمزور اولاد چھوڑ رہے ہوتے تو انہیں کیسے کیسے اندیشے لاحق ہوتے، پس چاہیے کہ لوگ اللہ سے ڈریں۔

۱۹۔ وصیت کا قاعدہ قرآن مجید وراثت کا قانون مقرر کرنے کے ساتھ آدمی کو یہ ہدایت بھی دیتا ہے کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکے کے بارے میں وصیت کر دے:

میں تقسیم کیا جائے گا جو غیروں کی بہ نسبت میت سے کوئی قرابت رکھتے ہوں۔ لیکن اگر کوئی رشتہ دار سرے سے موجود ہی نہ ہو تو پھر یہ مال اسلامی حکومت کے خزانہ میں داخل ہوگا۔ (نیل الاوطار، ج ۶، ص ۴۷-۵۶)

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ (۲: ۱۸۰)	تم پر لکھ دیا گیا کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آئے اور وہ کافی مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے جائز طریقہ پر وصیت کر دے، یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔

اس حکم کا منشا یہ ہے کہ ایک تو مرنے والا خصوصیت کے ساتھ اپنے والدین کے حق میں اپنی اولاد کو حُسنِ سلوک کی وصیت کر جائے، کیونکہ ان سے بوڑھے دادا دادی کی خدمت کی توقع کم ہی کی جا سکتی ہے۔ دوسرے اس کے خاندان میں جو افراد ایسے ہوں جنہیں قانون کے مطابق میراث میں سے حصّہ نہیں پہنچتا، مگر مرنے والا انہیں مدد کا مستحق سمجھتا ہو تو انہیں اپنے ترکے میں سے حصّہ دینے کی وصیّت کر دے۔ اس کے علاوہ ایک شخص اگر بہت مال چھوڑ رہا ہو تو وہ رفاہِ عام کے کاموں کے لیے بھی وصیّت کرنے کا مجاز ہے۔ کیونکہ مذکورۂ بالا آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ وصیت کی اجازت صرف والدین اور رشتہ داروں تک ہی محدود رہے[۲۸]

وصیّت اور میراث کے اس قانون سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ شخصی املاک کے ترکوں کے معاملہ میں اسلامی اسکیم یہ ہے کہ دو تہائی تو لازماً قانونِ میراث کے مطابق تقسیم ہو، اور ایک تہائی مرنے والے کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس غرض کے لیے چاہے اسے صرف کرنے کی وصیت کر دے۔ بشرطیکہ وہ جائز طریقے پر ہو، یعنی وہ کام بھی جائز ہو

---

[۲۸] نیل الاوطار، ج ۶، ص ۳۲-۳۳۔ اس معاملہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح سے قرآن کا جو منشا معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کے لیے اپنے رشتہ داروں کو غریب و محتاج چھوڑ کر رفاہِ عام پر خرچ کرنے کی وصیّت کرنا پسندیدہ نہیں ہے۔ نیل الاوطار میں بخاری، مسلم اور دوسری کتبِ حدیث سے آنحضرتؐ کے جو الفاظ نقل کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں کہ "تیرا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ تو انہیں اس حال میں چھوڑے کہ وہ محتاج ہوں اور لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں"۔

جس کے لیے وصیت کی گئی ہے اور اس میں کسی کی حق تلفی بھی نہ ہو۔[۲۹]

۲۰۔ نادان لوگوں کے مفاد کی حفاظت | جو لوگ خفیف العقل ہونے کی وجہ سے اپنی املاک میں صحیح تصرّف نہ کر سکتے ہوں اور ان کو ضائع کر رہے ہوں، یا بجا طور پر اندیشہ ہو کہ ضائع کر دیں گے، ان کے بارے میں قرآن ہدایت کرتا ہے کہ ان کی املاک ان کے اختیار میں نہ دی جائیں بلکہ وہ ان کے سرپرست یا قاضی کے انتظام میں رہیں اور انہیں صرف اُس وقت سونپی جائیں جب اس امر کا اطمینان ہو جاتے کہ وہ اپنے معاملات کو ٹھیک طرح سنبھال سکیں گے:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ	اور اپنے اموال، جنہیں اللہ نے تمہارے لیے
جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيَامًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا	زندگی کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے، نادان لوگوں
وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا	کے حوالہ نہ کرو۔ البتہ انہیں اس میں سے کھلاؤ
وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ	اور پہناؤ اور ان سے معقول بات کرو۔ اور یتیموں
فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ	کی آزمائش کرتے رہو یہاں تک کہ جب وہ نکاح
اَمْوَالَهُمْ (۴: ۵-۶)	کی عمر کو پہنچ جائیں اور تم ان میں ہوشمندی محسوس
	کرو تو ان کے مال ان کے حوالہ کر دو۔

اس آیت میں ایک اہم نکتہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ شخصی املاک اگرچہ اُن اشخاص ہی کی ملک ہیں جو اُن پر قانوناً حقِ ملکیت رکھتے ہوں، لیکن وہ بالکلیہ انہی کی نہیں ہیں، بلکہ اُن کے ساتھ اجتماعی مفاد بھی وابستہ ہے۔ اسی بنا پر قرآن اَمْوَالَهُمْ (ان کے مال) کہنے کے بجائے اَمْوَالَكُمْ (تمہارے مال)

۲۹ہ وصیت کے قانون کی تشریح کرتے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے حقِ وصیت پر تین حدود عائد کیے ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیادہ سے زیادہ اپنے ایک تہائی مال کی حد تک وصیت کے اختیارات استعمال کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ جن لوگوں کو از روئے قانونِ وراثت کا حصہ پہنچتا ہو ان کے لیے کوئی وصیت دوسرے وارثوں کی رضامندی کے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ تیسرے یہ کہ کسی وارث کو وراثت سے محروم کرنے یا اس کے حصہ میں کمی کرنے کی وصیت نہیں کی جا سکتی۔ (نیل الاوطار، ج ۶، صفحہ ۳۱-۳۵۔)

کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ اور اسی بنیاد پر وہ سرپرستوں اور قاضیوں کو یہ اختیار دیتا ہے کہ جہاں شخصی املاک میں بے جا تصرف سے معاشرے کا اجتماعی نقصان کیا جا رہا ہو، یا ایسے نقصان کا معقول اندیشہ ہو، وہاں مالک کے حقِ ملکیت اور حقِ انتفاع کو برقرار رکھتے ہوئے اس کا حقِ تصرف اپنے ہاتھ میں لے لیں[۳۰]۔

۲۱۔ سرکاری املاک میں اجتماعی مفاد کا لحاظ: جو جائدادیں اور اموال اور آمدنیاں حکومت کی ملک ہوں، ان کے بارے میں قرآن ہدایت کرتا ہے کہ ان کا صرف محض دولت مند طبقوں کے مفاد میں نہیں بلکہ عام لوگوں کے مفاد میں ہونا چاہیے، اور خصوصیت کے ساتھ ان کے صرف میں معاشرے کے کمزور طبقات کی بھلائی کا زیادہ لحاظ رکھا جانا چاہیے:

مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُولِهٖ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ .... لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ ... وَالَّذِيْنَ تَبَوَّءُوا الدَّارَ وَالْإِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ ..... وَالَّذِيْنَ جَاءُوْا مِنْ بَعْدِهِمْ (۵۹: ۷-۱۰)

جو کچھ پھیر دے اللہ اپنے رسول کی طرف بستیوں کے لوگوں سے وہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے[۳۱] اور قرابت داروں کے لیے[۳۲] اور یتامیٰ اور مساکین اور مسافر کے لیے، تاکہ یہ مال صرف تمہارے مال داروں ہی میں چکر نہ لگاتا رہے... نیز وہ اُن غریب مہاجرین کے لیے بھی ہے جو اپنے گھروں اور جائدادوں سے نکال دیے گئے ہیں ... اور وہ اُن انصار کا حق بھی ہے جو مہاجرین

۳۰؎ ابن العربی، احکام القرآن، ج ۱، ص ۱۳۳۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن، ج ۱، ص ۴۵۲۔ الجصاص، احکام القرآن، ج ۲، ص ۷۲، ۷۳۔

۳۱؎ اس سے مراد اسلامی ریاست کے نظم و نسق اور دفاع کے مصارف ہیں۔ اسی مد سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء اپنا گزارہ لیتے تھے اور اپنے عمال (باستثناء عاملینِ زکوٰۃ) کی تنخواہیں بھی دیتے تھے۔

۳۲؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ نمبر ۲۰۔

کے آنے سے پہلے ایمان کے ساتھ دارالاسلام میں
مقیم تھے ... اور اس میں بعد کے آنے والوں کا
حق بھی ہے۔

۲۲۔ ٹیکس عائد کرنے کے متعلق اسلام کا اصولی ضابطہ | ٹیکس عائد کرنے کے بارے میں قرآن اس اصول کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ٹیکسوں کا بار صرف اُن لوگوں پر پڑنا چاہیے جو اپنی ضرورت سے زیادہ مال رکھتے ہوں، اور ان کی دولت کے بھی صرف اس حصے پر یہ بار ڈالا جانا چاہیے جو ان کی ضرورت سے زائد بچتا ہو:

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ (۲: ۲۱۹)	وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں، کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے بچے۔

اسلامی نظامِ معیشت کی خصوصیات | قرآن کے ان ۲۲ نکات میں انسان کی معاشی زندگی کے لیے جو اسکیم مرتب کی گئی ہے اس کے بنیادی اصول اور نمایاں خصائص یہ ہیں:

۱۔ اس میں معاشی اقدار کو اخلاقی اقدار سے الگ رکھنے کے بجائے ان کے ساتھ ہم آہنگ کیا گیا ہے اور معیشت کے مسائل کو مجرّد معاشی نقطۂ نظر سے لے کر حل کرنے کے بجائے انہیں اس مجموعی نظامِ حیات کے تناسب میں رکھ کر حل کیا گیا ہے جس کی عمارت اسلام نے کلیتہً خدا پرستانہ تصورِ کائنات و فلسفۂ اخلاق پر استوار کی ہے (نکات ۱، ۲، ۴، ۵)۔

۲۔ اس میں زمین کے معاشی وسائل و ذرائع کو نوعِ انسانی پر خدا کا فضلِ عام قرار دیا گیا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ شخصی، گروہی یا قومی اجارہ داریوں کی حوصلہ افزائی نہ کی جائے اور اس کے بجائے خدا کی زمین پر بنی نوعِ انسان کو اکتسابِ رزق کے زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک کھلے مواقع دیئے جائیں (نکتہ ۵)۔

۳۔ اس میں افراد کو شخصی ملکیت کا حق دیا گیا ہے مگر غیر محدود نہیں۔ فرد کے حقِ ملکیت پر دوسرے افراد اور معاشرے کے مفاد کی خاطر ضروری پابندیاں عائد کرنے کے ساتھ یہ اسکیم ہر فرد

کے مال میں اس کے اقربا، ہمسایوں، دوستوں، حاجت مند اور کم نصیب انسانوں، اور مجموعی طور پر پورے معاشرے کے حقوق بھی قائم کرتی ہے۔ ان حقوق میں سے بعض جبری طور پر قابلِ تنفیذ ہیں اور بعض کو سمجھنے اور ادا کرنے کے لیے خود افراد کو ذہنی و اخلاقی تربیت کے ذریعہ سے تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے (نکات ۳، ۵، ۷ تا ۱۵، ۱۷، ۱۹، ۲۰)۔

۴۔ انسانی زندگی کے معاشی نظام کو چلانے کی فطری صورت اس اسکیم کی رُو سے یہ ہے کہ افراد اسے آزادانہ سعی و جہد کے ذریعہ سے چلائیں اور ترقی دیں۔ لیکن یہ آزادانہ سعی و جہد اس میں بے قید نہیں رکھی گئی ہے، بلکہ معاشرے کی اور خود ان افراد کی اپنی اخلاقی و تمدنی اور معاشی بھلائی کے لیے اسے بعض حدود سے محدود کیا گیا ہے (نکات ۶، ۷۔ ۱۵، ۲۲)۔

۵۔ اس میں عورت اور مرد دونوں کو ان کی کمائی ہوئی اور میراث یا دوسرے جائز ذرائع سے پائی ہوئی دولت کا یکساں مالک قرار دیا گیا ہے اور دونوں صنفوں کو اپنے حقِ ملکیت سے متمتع ہونے کے یکساں حقوق دیئے گئے ہیں (نکات ۳، ۴، ۱۸)۔

۶۔ اس میں معاشی توازن برقرار رکھنے کے لیے ایک طرف تو لوگوں کو بخیلی اور رہبانیت سے روک کر خدا کی نعمتوں کے استعمال پر اُبھارا گیا ہے، اور دوسری طرف انہیں اِسراف و تبذیر سے سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے (نکات ۵، ۸ تا ۱۰)۔

۷۔ اس میں معاشی انصاف قائم کرنے کے لیے یہ انتظام کیا گیا ہے کہ دولت کا بہاؤ نہ تو غلط ذرائع سے کسی خاص سمت میں چل پڑے اور نہ جائز ذرائع سے آئی ہوئی دولت کہیں ایک جگہ سمٹ کر بے کار رُکی رہ جائے۔ اس کے ساتھ وہ یہ انتظام بھی کرتی ہے کہ دولت زیادہ سے زیادہ استعمال اور گردش میں آئے اور اس کی گردش سے خصوصیت کے ساتھ اُن عناصر کو حصہ ملے جو کسی نہ کسی وجہ سے اپنا مناسب حصہ پانے سے محروم رہ جاتے ہوں (نکات ۶ تا ۱۰، ۱۲، ۱۳، ۱۵، ۱۷ تا ۱۹، ۲۱)۔

۸۔ یہ اسکیم معاشی انصاف قائم کرنے کے لیے قانون اور ریاست کی مداخلت پر زیادہ انحصار

نہیں کرتی۔ چند ناگزیر تدابیر کو ریاست کی ذمہ داری قرار دینے کے بعد وہ اس مقصد کے لیے اپنی بقیہ تدابیر کا نفاذ افراد کی ذہنی و اخلاقی تربیت اور معاشرے کی اصلاح کے ذریعہ سے کرتی ہے تاکہ آزاد سعی و جہد کی معیشت کے منطقی تقاضوں کو برقرار رکھتے ہوئے معاشی انصاف کا مقصد حاصل ہو سکے (نکات ۵ تا ۲۲)

۹۔ معاشرے کے مختلف عناصر میں طبقاتی کشمکش پیدا کرنے کے بجائے وہ اس کے اسباب کو ختم کر کے اُن کے درمیان تعاون اور رفاقت کی رُوح پیدا کرتی ہے (نکات ۴، ۶ تا ۱۱، ۱۲، ۱۵ تا ۱۷، ۲۱، ۲۲)۔

یہ اصول نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں جس طرح عملاً ریاست اور معاشرے کے نظام میں نافذ کیے گئے تھے اس سے ہم کو احکام اور نظائر کی شکل میں بہت سی مزید تفصیلات حاصل ہوتی ہیں۔ لیکن یہ بحث اِس مضمون کے موضوع سے خارج ہے۔ اس کے متعلق حدیث، فقہ، تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں وسیع مواد موجود ہے جس کی طرف تفصیلات کے لیے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

فہرست مآخذ

قرآنِ حکیم۔

بیضاوی، انوار التنزیل، مصطفی البابی حلبی، مصر، ۱۳۳۰ھ (۱۹۱۲ء)،

آلوسی، رُوح المعانی۔ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ، مصر، ۱۳۴۵ھ

الجصاص، احکام القرآن، مطبعۃ البہیۃ، مصر، ۱۳۴۷ھ

ابن العربی، احکام القرآن، مطبعۃ السعادہ، مصر ۱۳۳۱ھ

ابن جریر، جامع البیان، مطبعۃ الامیریہ، مصر، ۱۳۲۸ھ

ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم، مطبعۃ مصطفیٰ محمد، مصر، ۱۹۴۷ء
الزمخشری، الکشاف، المطبعۃ البہیۃ، مصر، ۱۳۴۳ھ
البخاری، صحیح
مسلم، صحیح
ابوداؤد، سنن
الترمذی، سنن
النسائی، سنن
ابن ماجہ، سنن المصطفیٰ
الشوکانی، نیل الاوطار، مصطفیٰ البابی، مصر، ۱۳۴۷ھ
ابن عبدالبر، الاستیعاب، دائرۃ المعارف، حیدرآباد، ۱۳۳۷
ابن منظور، لسان العرب، بیروت، ۱۹۵۶ء